شاہ نواز
پی ایچ۔ ڈی، اردو اسکالر، جامعہ پشاور

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین
صدر شعبہ اردو،جامعہ پشاور

وارث علوی۔۔۔۔ایک تخلیقی نقاد

Shah Nawaz

Ph.D, Urdu Scholar, Peshawar University.

Prof. Dr. Rubina Shaheen

Head Department of Urdu, Peshawar University.

Waris Alvi : As a Creative Critic

Waris Alvi (1928_2014) had authored 24 books. He was among the top three living Urdu literary critics in the country, the other two being Dr Shamsur Rahman Faruqi and Dr Gopichand Narang.Waris Alvi contributed to Urdu language and literature as distinguished critic, researcher and a professor. He is counted among very few Urdu critics who presented his original analysis without any care for personal relations or career growth. Waris Alvi is a renowned critic of Urdu literature. He is known for his critical writings on fiction, fiction writers and fiction critics. He would often term his style as 'creative criticism' (takhliqi tanqeed)

Key words: *Literary, Criticism, Critical, Literature, Fiction.*

انسانی زندگی میں کسی شے کی رد و قبول اور انتخاب و انحراف میں تمیز اور بہتری کی خواہش کا نام تنقید ہے۔ تجسس اور خوب سے خوب تر کی جستجو ہمیشہ سے انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ اس تنقیدی قوت اور شعور کی بدولت انسان غاروں سے نکل کر کائنات کے وسیع و عریض فضا میں امن، آسائش اور تہذیب و تمدن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل بنا۔ تنقید کی ابتدا ً انسانی وجود سے منسلک ہیں۔ انسانی ذہن میں ابتدائے افرینش سے اچھائی برائی، رد و قبول اور پسند و ناپسند کا سلسلہ جاری

ہے۔ اس پسند و ناپسند اور انتخاب و انحراف سے کائنات میں تنوع اور رنگارنگی قائم ہیں۔ تنقید مبہم اور دھندلی چیزوں کو واضح کر کے فنکار اور قاری کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ اردو میں تنقیدی سرمایہ مغرب ہی کی مرہونِ منت ہے جو مقدار اور معیار میں مغربی تنقید کے مقابلہ میں بہت کم ہے اُردو میں فکشن کی تنقید پر بہت کم کام ہوا ہے اکثر ناقدین کے یہاں عملی تنقید میں فکشن نگاروں پر اچھے مضامین موجود ہیں لیکن نظری تنقید میں فکشن نگاری پر تنقیدی سرمایۂ بہت ہی محدود ہے۔

نظریاتی تنقید کا کام ادبی اور تنقیدی مسائل کے بارے میں نظریات وضع کرنا اور ان پر بحث کرنا ہے۔ نظریاتی تنقید کو عملی تنقید پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ نظری تنقید اپنے عہد کے معیار، اقدار، فکر و نظر اور احساس و شعور کو منطق بنیادوں پر پرکھتی ہے اور عملی تنقید کی بنیاد نظری تنقید پر ہی ہوتی ہے۔ نظریہ سازی کی صورت میں نظریاتی تنقید فلسفہ سے جا ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریہ ساز نقاد ہمیشہ کم ہی رہے ہیں۔ اس ضمن میں ارسطو، سڈنی، کولرج، آرنلڈ، ایلیٹ، آئی، اے رچرڈ، ایمپسن، ایچ لارنس، ہربرٹ ریڈ اور سارتر کا نام شامل ہے۔ اُردو میں نظریاتی تنقید کا سہرا حالیؔ، میراجیؔ، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، وزیر آغا، حامد کاشمیری، اور وارث علوی کے سر ہے۔ ان میں ایک اہم اور نمایاں نام وارث علوی کا ہے۔

وارث علوی کے تنقیدی نظریات اور اصول ان کے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں جن میں "تیسرے درجے کا مسافر (۱۹۸۱ء) "، "اے پیارے لوگو! (۱۹۸۱ء) "،"حالی مقدمہ اور ہم (۱۹۸۳ء)"، "خندہ ہائے بیجا (۱۹۹۰ء)"، "جدید افسانہ اور اس کے مسائل (۱۹۹۰ء)"،"فکشن کی تنقید کا المیہ (۱۹۹۲ء)"،"منٹو-ایک مطالعہ (۱۹۹۷ء)"،"راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ(۲۰۰۶ء)"، "ادب کا غیر اہم آدمی (۲۰۰۱ء)"، "لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر (۲۰۰۱ء)"،" منتخب مضامین(۲۰۰۰ء)"،"بت خانہ چین(۲۰۱۰ء)"اور"غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین(۲۰۱۳ء)"شامل ہیں۔

وارث علوی مغرب ناقدین میں ٹی۔ ایس ایلیٹ، میتھیو آرنلڈ اور ڈرائیڈن سے زیادہ متاثر نظر آتے ہے جبکہ مشرق میں حالیؔ، عسکری اور سلیم احمد کا ہمنوا ہے۔ ان کی ذہنی تربیت مغرب و مشرق کے تنقیدی اصولوں اور اعلیٰ ادبی فن پاروں سے ہوئی ہے۔ انہوں نے نظری تنقید میں ادب، فکشن اور تنقید کے علاوہ عملی طور پر فکشن نگاروں، نقادوں اور شعرا پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی انداز سے کام کیا۔ وہ ابتدا میں ترقی پسند تحریک میں شامل تھے لیکن چند سال بعد ترقی پسند تحریک کے کیمونزم، پروپیگنڈ ایئت اور جماعتی گروہ بندیوں کی وجہ سے وہ اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ اور اردو تنقید میں اپنے لیے ایک الگ راہ نکال کر کلاسیکیت اور حقیقت پسندیدیت کی طرف مائل ہو گئے۔

عملی تنقید کے میدان میں وارث علوی نے ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، وزیر آغا، باقر مہدی، عبادت بریلوی، سردار جعفری، ممتاز شیریں، حسن عسکری، سلیم اختر، وہاب

اشرفی، احتشام حسین، ممتاز حسین اور وحید اختر کی تنقید پر غیر جانبدار تجزیئے اور محاکمے پیش کیے ہیں جبکہ شعراء میں جوشؔ، میراجیؔ، ندا فاضلیؔ، محمد علویؔ، جاوید اخترؔ، غالبؔ، اقبالؔ، سوداؔ، عادل منصوریؔ، محبوب راہیؔ، باقر مہدیؔ، ساحر لدھیانویؔ، مرزا شوق لکھنویؔ، جان نثار اخترؔ، سردار جعفریؔ اور مخمور سعیدیؔ کی شاعری پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

وارث علوی فکشن کا نقاد ہیں۔ وہ ادیب کی آزادی اور تخلیقی قوتوں کا علمبردار نقاد ہے انھوں نے ہر جگہ ادب کو مقدم رکھا ہے۔ وارث علوی نے فکشن کی تنقید میں افسانے اور ناول کی ساخت اور تکنیک کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس لیے فکشن پر ان کی نظریاتی تنقید ایک نیا تجربہ ہے۔ انہوں نے پلاٹ، کہانی، کردار، واقعہ نگاری، زبان وبیان اور مختلف تکنیکوں کا افسانہ میں استعمال پر بصیرت افروز طریقے سے لکھا۔ انہوں نے افسانوں کے تجزیئے کے ساتھ افسانہ نگاروں کے فن پر بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں جن میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، بانو قدسیہ، خواجہ احمد عباس، سریندر پرکاش، سلام بن رازق، رام لعل، ترنم ریاض، عزیز احمد، رشید امجد، بلراج مینرا اور انتظار حسین شامل ہیں۔

وارث علوی نے فکشن کے عالمی منظرنامے کے حوالے سے اُردو میں غیر جانبدار، سائینٹفک تنقید کی بنیاد رکھی۔ ان کی افسانوی تنقید نے جہاں روایتی اور درسی تنقید کو رَد کیا ہے وہیں دوسری جانب فکشن کی نئی شعریات کی ترتیب میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ افسانوی تنقید کے حوالے سے ان کی اہم اور مشہور کتابوں میں "جدید افسانہ اور اس کے مسائل"، "فکشن کی تنقید کا المیہ"، "سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ"، "راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ"، "گنجفۂ باز خیال" کے علاوہ "سرزنشِ خار"، "ناخن کا قرض"، "کچھ بچا لایا ہوں"، "اوراقِ پارینہ"، "بورژواژی بورژواژی"، "ادب کا غیر اہم آدمی"، اور "بت خانہ چین" میں فکشن اور اس کی نظریاتی مباحث شامل ہیں۔

فکشن کی تنقید ہو یا شاعری کی تنقید وارث علوی کے یہاں تجزیاتی رنگ ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ جس کی ہماری یہاں تنقید میں بہت کمی تھی۔ انہوں نے کلاسیکی روایات سے کام لیتے ہوئے فکشن میں ہر قسم کی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام پر جو کہانی، پلاٹ اور حقیقت نگاری کے برعکس علامت، استعارہ، اسطور اور تجریدیت پر زور دے رہی تھی ان کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ وہ جدیدیت کے خلاف نہیں بلکہ ادب کے نام پر اس میں جو کرتب بازی دکھائی گئی اور جس انداز سے انہوں نے پیشرو کی روایت سے انحراف کیا ان نقادوں سے اختلاف کیا۔ انہوں نے فکشن اور اس کے کلاسیکی لوازمات کو ہر فورم پر اجاگر کیا۔ ان کے نظریاتی مضامین تکنیک اور اسلوب کی نوعیت کے لحاظ سے عام تنقیدی مضامین سے مختلف ہے۔ عملی تنقید کے علاوہ انہوں نے فن، فنکار، ادب، کلچر، سماج، عوام، پروپیگنڈہ، کمٹ منٹ اور تعلیم کے موضوعات پر جو مبسوط نظریاتی مضامین لکھے ہیں وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب، آرٹ، اور تہذیب کے معاملے میں انہوں نے کسی تحریک، رجحان یا مکتب سے کمٹ ہونا پسند نہیں کیا۔ انہوں نے سماج، تعلیم، تحقیق، کمرشل کلچر، ہائی کلچر، بورژوا کلچر، اکاڈمنک کلچر، آئیڈیالوجی، کمٹ منٹ اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے مکتبی، معاشرتی، تدریسی، مارکسی، لسانیاتی،

اسلوبیاتی اور ساختیاتی تنقید نگاروں کی سطحیت کو بے نقاب کیا۔ سفید پوش، وضع دار اور پوپلے منہ والے ثقہ نقادوں پر منطقی انداز میں دلائل کے ساتھ اُن کی قلعی کھولی ہے۔ اپنی تنقیدی قوتوں کے ذریعے نقادوں کی آمریت ختم کو کیا۔ ان کے ہر مضمون سے مباحث کے نئے باب کھولتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سہیل احمد لکھتے ہیں:

"وارث علوی کے مضامین ایک ایسے شخص کے مضامین ہیں جو ادب سے بھر پور لذت لینے کا اہل ہے اور دوسروں کو اپنے تجربے میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت جب نقاد عموماً کچھ نئے علوم کے نظریات بیان کرتے رہتے ہیں اور ادب پاروں کا ذکر برائے بیت ہی کرتے ہیں۔"(۱)

وارث علوی کو عہد حاضر کے ممتاز نظریاتی ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وارث علوی خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے ادبی نظریات، تصورات اور خیالات پر بحث کی ہے نظریہ سازی نہیں کی۔ انہوں نے اپنا کوئی تنقیدی نظریہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ مختلف تنقیدی نظریات اور تصورات سے کام لیا ہے ہیں اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"اپنی تنقیدوں میں میں نے نظریات، تصورات، خیالات سے بحث کی لیکن نظریہ سازی نہیں کی کیونکہ میں نے اپنے لیے ادبی نقاد کا جو منصب پسند کیا تھا وہ ادب کی تفہیم اور تحسین تک محدود تھا اس مقصد کے لیے ادبی نظریات کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی جتنی کہ وسیع اور رنگارنگ ادبی تحریر اور تصورات کی جو بڑے فلسفوں اور نظریوں پر مبنی اور ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کام لیا اور کام نکالا۔"(۲)

ان کی تنقید پر کسی مخصوص دبستان یا گروہ کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی تنقید کو امتزاجی تنقید کا نام دیتے ہیں جس میں ہر تنقیدی نظریہ اور دبستان سے حسبِ ضرورت کام لیا جا سکتا ہے۔ وارث علوی کے مطابق ادب اور ادیب کو ہر قسم کی ذہنی، نظریاتی، مذہبی اور آدرشی رجحانات سے آزاد ہونا چاہیے۔ کیونکہ ان بندشوں سے ادیب کی ذہنی صلاحیتیں محدود ہو جاتی ہیں۔

وارث علوی کے مطابق حسن عسکری اور سلیم احمد بڑے نقاد ہیں۔ ان کے مزاج اور اسلوب پر ان نقادوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ اُن کے مطابق عسکری صاحب اپنے طور پر ایک الگ ہی دنیا ہے۔ عسکری صاحب کے ایک شاگرد سلیم احمد کا اسلوب بہت ہی منفرد اور دلچسپ تھا۔ وارث علوی کو سب سے زیادہ متاثر تو سلیم احمد نے ہی کیا۔ انہوں نے اپنے اسلوب کو سلیم احمد کے اسلوب میں ہی ڈھالنے کی کوشش کی اور اس میں اس قدر کامیاب ہوا کہ اپنا رنگ الگ پیدا کر دیا۔

نقاد جب کسی ادب پارے کی تکنیک، اندازِ بیان، استعاروں، علامتوں وغیرہ کے وسیلے سے اس کی روح تک پہنچتا ہے تو گویا وہ اپنے معمول کی ہر ادا کو، اس کے ہر رنگ کو، اور ہر کیفیت کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تب مواد،

وسائل، اظہار اور بیانیہ کا اندرونی آہنگ سب ایک ہو جاتے ہیں اور ادب پارہ کو پوری طرح روشن، واضح اور اپنے پوشیدہ اسرار کھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کو اصطلاحی زبان میں تخلیقی تنقید کہا جاتا ہے۔ وارث علوی اسی قسم کی تنقید کا قائل ہے۔

وارث علوی کی تنقید میں جو بے باکی، فقرہ بازی اور طنز و مزاح ملتا ہے یہ حسن عسکری اور سلیم احمد کی دین ہے۔ وارث علوی نظریات سے کام نکالتے ہیں اور ادبی مسائل کو ان ہی کی مدد سے سمجھتے اور پرکھتے ہیں۔ وارث علوی نے تنقید میں شگفتہ، دلچسپ اور ربیاکانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے اس میں تخلیقیت پیدا کی ہے۔ سلیم احمد کی پیروی میں انہوں نے طنز و مزاح، ظرافت اور بذلہ سنجی میں وہ مخصوص طرز پیدا کیا ہے جس کا موجد بھی اور خاتم بھی وہ ہے۔ شاعری کے متعلق چند مثالیں ملاحظہ ہو:

"لفظ چوراہے کی وہ طوائف ہے جسے شاعر اپنی تخیلی لمس سے حجلۂ شعر میں ایک نئی دلہن بناتا ہے"۔(۳)

"شاعر سوچتا ہے ساری زندگی بھری پُری عورتوں کی گولائیوں کو نکیلے شعروں میں سماتے گزری، اگر موٹے کمیساروں کی کمر کے گھیراؤ کو بھی ایک دو قصیدوں کے گھیر میں لیا ہوتا تو نامۂ اعمال اس قدر سیاہ نہ ہوتا۔"(۴)

یہ ان کے اسلوب ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک طرف فقرہ بازی ہے تو دوسری طرف اقوال زریں کی چمک دمک۔ فضیل جعفری کا وارث علوی کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ سلیم احمد کے بعد وارث علوی نے فقرہ بازی کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اب کسی اور کا پہنچنا دشوار ہے۔ پروفیسر محی الدین بمبئی والا صاحب لکھتے ہیں:

"سلیم احمد کے بعد وارث علوی نے فقرہ بازی کو اس مقام تک پہنچایا جہاں اب کسی اور کا پہنچنا دشوار ہے۔ میں نے ان سے ایک بار پوچھا تم میں یہ ظرافت آئی کہاں سے۔ تمہارے والد صاحب تو بہت مذہبی اور مقطع آدمی ہیں۔ کہنے لگے یہ میری والدہ کا ورثہ ہے جو اپنے وقت میں اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ بذلہ سنج خاتون تسلیم کی گئی تھیں۔"(۵)

وارث علوی کا کمال یہ ہے کہ تنقید جیسے سنجیدہ اور اصطلاحوں اور جارگون سے بھری ہوئی ثقیل صنف ادب کو بھی ان کی ظرافت نے لالہ زار بنا دیا اسی وجہ سے انہیں صاحب اسلوب نقاد کہا جاتا ہے۔ وارث علوی کی تنقید میں جو تخلیقیت ہے ان کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا کہ یہ تنقید کی زبان نہیں ہے۔ باقر مہدی نے اپنے خاکے "پیارے دقیانوسی وارث علوی" میں وارث علوی کو دقیانوسی کہا اور شمس الرحمٰن فاروقی انہیں فکشن کے ناقد سے زیادہ قصہ گو یا داستان گو کہتے ہیں۔ کسی نے جھٹکے اور کھٹکے کی تنقید کہا کسی نے یہ کہا کہ اس نے ادب پر باتیں کم کی ہیں ادب کے متعلقات پر زیادہ۔ کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے سلیم احمد کی نقل اڑائی ہے اور ایک صاحب نے ان کے ذہن کو لذت پرست کہا ہے۔ ان باتوں کا جواب وارث علوی یوں دیتے ہیں:

"افسانوں پر میری اس نوع کی گفتگو سے اگر فکشن کے پُرشوق قاری کو تھوڑی بہت بھی فرحت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں۔"(۶)

ظہیر عباس اپنے مضمون "وارث علوی کا تنقیدی اسلوب" میں لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے وارث علوی کی اس کتاب پر اعتراضات بھی کئے ہیں کہ یہ تنقید کی زبان ہی نہیں ہے۔ ان کے یہ اعتراضات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں یہ واقعی تنقید کی زبان نہیں ہے یہ تو تخلیق کی زبان ہے جسے ایک ادب کا مارا ہوا تنقید میں نبھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لوگوں کی بے جا دشنام طرازیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ واقعتاً وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اب تو آپ ریٹائرڈ ہو چکے کیا کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کتابیں پڑھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں ہاں وہ تو کرتے ہی ہو اس کے علاوہ کیا کرتے ہو۔ ان کا مطلب ہوتا ہے کہ مسلمان بچوں کے لیے انگریزی میڈیم سکول چلانے یا تبلیغی جماعت میں جانے کا کوئی مفید یا نیک کام۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس کے پاس "علاوہ" کام ہوتے ہیں۔ وہ کتابیں نہیں پڑھتا اور جو پڑھتا ہے وہ "علاوہ" کام نہیں کرتا"۔(۷)

"احمق زندگی میں ملتے ہیں۔ نیم احمق تنقیدوں میں نظر آتے ہیں۔ اس لیے زندگی تنقید سے زیادہ قابل برداشت ہے"۔(۸)

وارث علوی کی تخلیقی قوت نے تنقید میں بھی نئے الفاظ و تراکیب تراشے ہیں مثلاً ہچر مچر، دو دل چھینک، نثر کے قتلے، سبزی منڈی کے اوبڑ کھابڑ سڑکیں، نعلین برادری، فکر کے گڑھے، جوتیاں چٹخارے، رگید نہیں سکتے، نظریئے کی لاش، میٹھی خارش، پتلون کے پچھلی جیب میں اڑسا ہوا، پرکشش شوہر، آستین پر دل لٹکا کر گھومنے والی نسائی جذبات، کھدر پوش تصورات اور تخت شاہی پر پھر کتا جیسے نئے الفاظ و اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس قسم کی تخلیقی صلاحیت کے لیے شعور، سوچ کی پختگی اور زبان و بیان پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کئی ادیب اور نقاد لفظ و معنی اور ہیئت کے ادراک میں بھول بھلیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ نثر اور نظم کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نثر میں استعارہ عموماً مرد کے سینہ کی مانند سپاٹ ہوتا ہے اور نظم میں عورت کے سینہ کی مانند ابھرا ہوا۔ مرد کو چوڑا سپاٹ سینہ ہی زیب دیتا ہے اور عورت کو اُبھرا ہوا۔"(۹) بے وقوفوں کی جنت میں رہنے کی بجائے ملٹن کے باغی ابلیس کے ساتھ جہنم میں رہنا مجھے زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔"(۱۰)

وارث علوی کی تنقید میں ان کے فقرہ بازی، طنزومزاح اور بذلہ سنجی نے تخلیقی انداز اختیار کیا ہے۔ ان کا مخصوص اسلوب قاری کو پورا مضمون پڑھنے پر مائل کرتا ہے جس میں تنقید اور تخلیق کا بہترین ملاپ موجود ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین نے ان کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کو تنقید کے لیے غیر معیاری قرار دیا ہے۔ تاہم وارث علوی خود کہتے ہیں کہ تنقید میں ان کے ظریفانہ اسلوب کا مقصد قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنا ہے جس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ جاوید صدیقی نے جب ان سے تنقیدی زبان کے متعلق سوال کیا تو وارث علوی کا جواب یہ تھا:

"نہیں بھئی میں جو زبان لکھ رہا ہوں وہ تو میری ہے۔ تنقید کی زبان شگفتہ ہونی چاہیئے مگر موضوع بھی زبان کو طے کرتا ہے۔ "اوراق پارینہ" میں میرے سب مضامین بے حد سنجیدہ ہیں۔ بیدی پر پوری ایک کتاب ہے جس میں کوئی فقرے بازی نہیں۔ تمام چیزیں میرے یہاں ملتی ہیں جہاں سنجیدہ زبان کی ضرورت ہو وہاں پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھتا ہوں لیکن جہاں ہنسنے کا موقع ملتا ہے وہاں ہنسوں کیوں نہیں۔"[۱۱]

وارث علوی کی تنقید میں زبان کے مختلف برتاؤ ملتے ہیں جس میں انشائیہ نگاری، لطیفہ گوئی، فقرے بازی اور تخلیقی عناصر کا غلبہ ہے۔ البتہ منٹو، بیدی اور حالی پر ان کی کتابوں میں سنجیدہ اور عالمانہ زبان استعمال ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کے مضامین میں بے جا طوالت اور غیر ضروری تفصیلات بھی زیادہ ملتی ہیں تاہم اپنے موضوع کو بھی دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنے پر بصیرت مندانہ انداز سے کام لیتے ہیں۔ باقر مہدی نے وارث علوی پر جو خاکہ "پیارے دقیانوسی۔۔۔۔وارث علوی" کے نام سے لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ وارث علوی کو مضمون کے تنقیدی مزاج کی اتنی فکر نہیں رہتی جتنی اسے نہایت دلچسپ بنانے کی فکر رہتی۔ فضیل جعفری نے وارث علوی کی تنقید کے حوالے سے لکھا ہے:

"وارث علوی عملی نقاد نہیں، 'تخلیقی نقاد' ہیں۔ ان کا طائر تخیل چو مکھی اڑانیں بھرنے پر قادر ہے وہ افسانوں سے بحث کرتے ہوئے جنسیات، نفسیات، عمرانیات اور مابعد الطبیعاتی وغیرہ پر روانی اور بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ایک ہی بات کو مختلف پیرائے میں بیان کرنا، تشبیہوں کی مدد سے ایک کے بعد دوسرا خوبصورت جملہ تراشتے جانا، مرادفات اور ہم معنی الفاظ کو اس وقت تک دوڑانا جب تک سارا خزانہ خالی نہ ہو جائے اور کبھی کبھی بے رائی کا پہاڑ بنانا ان کے اسلوب کے خصوصی اور انفرادی اوصاف ہیں۔"[۱۲]

وارث علوی کا طریقہ تنقید اور تماشائے تخلیق بے جان الفاظ میں جان آفرینی ڈالنا ہے۔ ان کی ترجیح آزادانہ سطح پر تخلیقی تجربے میں شمولیت پر ہے جس میں قاری بھی شریک ہو۔ فکشن اور اس کی تنقید سے وارث علوی کو خصوصی دلچسپی ہے ۔ انہوں نے یورپ، امریکی اور روسی فکشن کے تناظر میں اُردو فکشن کو دیکھا ہے۔ انہوں نے نے فنکار اور فن پارہ کے تجزیہ

وتحلیل اور تنقیدی نتائج اخذ کرنے میں ہمیشہ توازن واعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔ اپنی بات یارائے کو مستحکم کرنے کے لیے انگریزی، فرانسیسی اور روسی مفکرین ونقاد کے کلام سے حوالے دیئے ہیں۔ دوسرے نقادوں کے برعکس ان میں تعصب اور طرفداری کم ہے۔ ان کی کتابوں میں جگہ جگہ طنز وظرافت اور چٹکلا بازی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ سنجیدہ مضامین کو ٹھٹھول کر بیان کرنا اور پھر اسے سلجھانا انہوں نے عسکری سے سیکھا تھا۔ چند مثالیں:

"میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح ہر آدمی میں ایک امکانی قاتل ہوتا ہے اسی طرح ہر اُردو والے میں ایک امکانی شاعر بھی ہوتا ہے۔ اس کا ایک پاؤں زمین شعر پر تو دوسرا موج امکانی میں ہوتا ہے، جسے "موج عارض" بنتے دیر نہیں لگتی۔"(۱۳)

"اقبالؔ نے ستم یہ کیا کہ جس دیس کے نوے فیصد لوگوں کے ہاتھ میں گھڑی نہیں تھی اس کے دانشوروں کو وقت کے فلسفے پر غور کرنے کی دعوت دی۔"(۱۴)

ان فقرے بازیوں سے وارث علوی کے نظامِ فکر اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تنقید، تنقید کا منصب ،تنقیدی طریقہ کار، تنقیدی روایت، جمالیات اور اس کے مسائل، مطالبات اور اخلاقیات کو وارث علوی نے مختلف مضامین میں فقرہ تراشیوں سے واضح کیا ہے۔ تاہم ان کا اسلوب ہر قسم کی عقیدت، حسد اور جذباتیت سے پاک ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی ناقدانہ دیانت داری اور جرأتِ اظہار کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی کہتے ہیں:

"اب جب ان کی ساری کتابیں میرے پیش نظر ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کے تنقیدی جارحانہ اسلوب کو منہا کیا جاسکتا ہے اس لیے ان کی کتابیں علم کا دریا ہیں تو ان سے موتی نکالنے کے لیے غواصی کرنی ہی پڑے گی۔ یہ اور بات ہے کہ سطح پر بھی معنویت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وارث علوی ہمارے جید نقادوں میں ایک ہیں ان کے ذہنی آفاق کو سمجھنا چاہیئے۔"(۱۵)

وارث علوی کے طنزیہ اور ظریفانہ فقرے دراصل ادبی منظرنامے اور داخلی اور باطنی منظر کے ٹیڑھے ترچھے، نامانوس اور ناہموار سلسلے کی روداد بن جاتے ہیں جس میں ہمارے ضمیر اور حساس وپرُشوق قاری کی روح ایک ساتھ بے چین نظر آتی ہے۔ اسلوب کی یہ بے ساختگی، ظرافت اور خوش طبعی ان کی تحریر کو دلچسپ بناتی ہے۔ مطالعۂ ادب اور نقدادب کو وارث علوی نے جینے کے اسلوب کے طور پر شدت سے برتا ہے۔ انھیں "پوز" اور "کٹھ ملائیت" سے اس وجہ سے نفرت ہے کہ اس میں "جھوٹی انا" اور "عقیدے" کو عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

"دوسروں کو پاجی اور خود کو ناجی، دوسروں کو بیمار اور خود کو مسیح الزماں سمجھ کر بات کیجیے اور پھر دیکھیے کہ تنقیدی اسلوب میں کیسے ہر لفظ موچھوں کو بل دیتا ہوا اور ران پر ہاتھ مار کر پہلوان کی طرح اینڈ تا ہوا نظر آتا ہے۔"(۱۶) "ادیبوں کو پھولوں میں تولا اور گنگا جل میں نہلایا جاتا ہے کہ صاف ستھرے رہیں اور صاف ستھرا ادب پیدا کریں۔"(۱۷) "جس طرح عورت پر حکمرانی کے لیے مرد کا شوہر ہونا کافی ہے اسی طرح شاعری پر حکمرانی کے لیے صرف غزل گو ہونا کافی ہے۔"(۱۸)

ایک اچھی کتاب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے۔ ان کی دلچسپی اس وقت تک برقرار رکھے جب تک تمام کتاب کمال سے پڑھ نہ لے۔ اگر ایسی کتابوں کی فہرست سازی کی جائے تو اس میں وارث علوی کی کتابیں بغیر کسی حجت کے شامل ہوں گی۔ وارث علوی بے ساختہ، برملا اور بے تکلف زبان کے استعمال میں ماہر ہیں۔ اس کا اندازِ نگارش عالمانہ موشگافیوں سے یکسر پاک ہے۔ ان کے مضامین کے عنوانات بظاہر چونکانے اور مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں لیکن اندر کے مباحث زبان کی سطح پر پر لطف اور مواد کی سطح پر فکر انگیزی کو پروان چڑھاتے ہیں۔۔ اس سلسلے میں شمس الحق لکھتے ہیں:

"وارث کو ہم صرف اس لیے یاد نہیں رکھیں گے یا وارث اُردو ادب میں صرف اس لیے یاد نہیں رکھا جائے گا کہ اس نے تنقید کو ایک شگفتہ بیانیہ یا الگ شگفتہ انشائیہ تحریر بنایا بلکہ جانے انجانے طور پر متعدد ذہنوں کو یہ تربیت بھی وارث نے دی ہے کہ ادب پڑھنے والے کو کس طرح جینا چاہیے۔ ادیب کو کس طرح جینا چاہیے ؟"(۱۹)

وارث علوی کے اسلوب کی ایک اہم خوبی اسطور بیانی بھی ہے۔ اس قسم کی حوالوں کے لیے نقاد ثقافت یا تہذیب سے جو اسطور اخذ کرتا ہے اس کی آرکی ٹائپل توجیہہ بھی بیان کرتا ہے۔ فن پارے کی ساخت اور اس کے لِسانی اور بیانیہ تعمل کی تفتیش کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وارث علوی کے اسطوری حوالوں کا تعلق فن پارے کی بجائے لسانی تعمل سے ہوتا ہے۔ ان کے مضمون "تذکرہ روح کی اڑان کا، گندی زبان میں" میں جو اسطوری حوالے بیان کیے گئے ہیں ان میں مسیح، کلیم اللہ، بچھڑے کی پرستش، کوہ طور، بلبل شیراز، طوطیٔ ہند، گنگا جل میں نہلایا جانا، احمد شاہ ابدالی، ہفت خواں، کیلاش کے دیوتا، درختوں کی شاخوں پر عورتوں کی کٹی ہوئی گردنیں، کوہ کنی، خلیل اللہ، خلیل خان، اولادِ ابرہیمؑ، آگ، سانپ کا من اور شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانا شامل ہیں جو اُردو اور فارسی کے تلمیحی اور اسطوری زبان میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے افسانے یا شعر کی معنوی پرتوں میں اضافہ ہوتا ہے شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"فاختے اڑانا اس کے نزدیک شوق فضول ہے اور اسی لیے وہ خلیل خان کی بات کو خلیل اللہ تک پہنچاتا ہے کیونکہ وہاں آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے اور امتحان ہے اور امتحاں میں مدرس کی دلچسپی

عیاں ہے۔"[۲۰] "اہل ایمان کی نظر ہمیشہ عقبیٰ پر رہتی ہے اس لیے کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے حور و قصور کا معاملہ کھٹائی میں پڑے۔"[۲۱] "مدرسہ کی فضا ہی ایسی ہوتی ہے کہ لسان العصر، بلبلِ شیراز اور طوطیٔ ہند سب سرمہ پھانک لیتے ہیں"۔ [۲۲] "فن کی کشش، عورت کے جواں جسم کی پکار اور پہاڑ کا بلاوا بن جاتی ہے۔"[۲۳]

وارث علوی نے اپنی ذات کے مخصوص جذباتی تقاضوں پر ہنسنے اور مسکرانے کا جو سلیقہ اپنایا ہے وہ کسی اور نقاد کے یہاں نہیں ملتا۔ اپنی کم علمی اور اپنی شکست کا اعتراف اس قدر خوبصورت انداز سے کیا کہ ان میں خود نمائی اور خود پسندی کی جگہ عجز اور انکساری نمایاں نظر آتی ہے۔

"وہ نازک مزاج نو اب زادہ نہیں ہوں جسے نو مَن روئی کے گدوں میں لٹایا گیا ہو اور محلہ کے آوارہ چھوکروں کی صحبت سے محفوظ رکھا گیا ہو۔"[۲۴] "Devil Quotes the Bible اس محاورے کا اُردو ترجمہ میں اس لیے نہیں کر رہا کہ ترجمہ میں لا محالہ شیطان یا ابلیس کا لفظ آتا ہے اور اس لفظ کے لیے جملہ حقوق میں نے اپنے ذات کے لیے محفوظ کر لیے ہیں۔"[۲۵] "کتاب کو ڈی بینک Debunk کرنے کا کام علم سے زیادہ ایک خاص قسم کی شیطانی کا رگزاری پر مبنی ہے جس سے انگریزی میں ایلیٹ اور اُردو میں علوی واقف ہیں، گویا دونوں کے درمیان فرق مراتب چہ نسبت خاک را با عالم پاک والا ہے۔"[۲۶]

وارث علوی کے بذلہ سنج، بیباک، برجستہ اور ظرافت سے بھرپور اسلوب کو ناقدین نے تنقید کے لیے مضر قرار دیا ہے حالانکہ اس اسلوب میں جو تخلیقیت، بے ساختگی اور حاضر جوابی ہے وہ اُردو کے کسی اور نقاد کے یہاں نہیں ملتی۔ اس وجہ سے باقر مہدی نے وارث علوی کے گل افشانی گفتار کو نثری اوپیک کہہ دیا ہے۔ وارث علوی کے مطابق اگر تنقید میں کوئی چیز طبع زاد ہے تو وہ فقرے بازیاں ہی ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ تنقید میں قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کو مقدم رکھتے ہیں تب ہی انہوں نے یہ شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

وارث علوی کے ناقدانہ اسلوب میں زبان کے تخلیقی استعمال میں فقرے اور فقرے بازیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وارث علوی اگرچہ عادتاً طوالت نویسی سے کام لیتے ہیں لیکن فقرہ بازی میں اپنی بات کو Capsule بھی کر دیتے ہیں۔ ان فقروں سے جہاں نیا جہان آباد کرنے اور اڑان بھرنے کا کام لیا گیا ہے وہاں حوالوں سے کٹ کر بھی یہ اتنے خود کفیل، با معنی اور زرخیز ہیں کہ بباطن ایک جامع مضمون کا مواد رکھتے ہیں وزیر آغا کے متعلق لکھتے ہیں:

"بس آغا صاحب کی یہی مصیبت ہے کہ پتھر مارنے کے لیے پہاڑ توڑنے جاتے ہیں۔"[۲۷] "آغا صاحب کی تنقید میں ہر شاعر کے گھونسلے میں انڈا دیتی نظر آتی ہے۔"[۲۸]

وارث علوی کی کتابوں کے عنوانات جیسے ''کچھ بچالایا ہوں"، "پیشہ تو سپہ گری کا بھلا"، "اے پیارے لوگو!"، "خندہ ہائے بیجا"، "سرزنش خار"، "گنجفۂ بازخیال" اور "بت خانۂ چین" سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے مضامین میں سنجیدہ، دقیع اور مشکل اسالیب کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنے مضامین میں فن، فنکار اور فن پارے کے متعلق جو بات دو فقروں میں بیان کرتے ہیں ان کو مبسوط مضامین سے بھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سیدھی سادھی زبان میں فقروں کو اس طرح تراشتے ہیں کہ ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ ان کے فقروں میں جو تمسخر، ظرافت اور استہزا ہے وہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ اور طربیہ منظر پیش کرتی ہے۔ سنجیدہ گفتگو کو غیر سنجیدہ انداز میں بیان کرنا، الفاظ کی مخصوص تنظیم اور مکالموں کی چستی سے انہوں نے مضامین میں وہ جوہر پیدا کیا ہے جو بہت کم ادیبوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں:

"ایٹم بم کی موجودگی میں پھول اور عورت پر شعر کہنا زبردست ذہنی عیاشی ہے۔"(۲۹)
"نقاد شاہی حرم کا وہ خواجہ سرا ہے جو اختلاط کے سب گر جانتا ہے لیکن خود کچھ کر نہیں سکتا۔"(۳۰)

وارث علوی کے تنقیدی اسلوب کے لیے سب سے زیادہ تنقیدی مواد ترقی پسند تحریک نے مہیا کیا۔ انہوں نے اس تحریک کی مکمل قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ان کے ہر مضمون میں ترقی پسندی کو جارحیت اور انتہا پسندی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ تجزیاتی مطالعہ اور معروضیت کی کمی، پروپیگنڈے کا تشہیر اور ادب کے خارجی عوامل پر زور جیسی خامیوں کو وارث علوی نے موضوع بحث بنادیا ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب سے جو غیر ادبی کام کروائے ہیں وارث علوی نے ان کو مذہبی اصطلاحوں اور فقرہ بازی کی صورت میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جن میں اعمال صالح، تزکیۂ نفس، صراطِ مستقیم، جدلیاتی جدوجہد کا جہاد، راہِ حق، تالیف قلب، رومانیت کا کلمۂ کفر، قلعہ کفار سے اہل ایمان کی صفوں پر حملہ، بدعتوں اور شعور ولاشعور کے بت پوجنے والے دجال جیسی اصطلاحات سے ترقی پسندوں کی سرزنش کی ہے چند اقتباسات یہ ہیں:

> "ان کا تعلق نہ ادب سے ہے نہ زندگی سے بلکہ اعصاب زدہ بوڑھی کنواریوں کی طرح پیٹ کی باؤ گولوں کے مسائل سے ہے۔ بوڑھی کنواریوں سے ہمدردی کی جاسکتی ہے لیکن ان کے ساتھ وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔"(۳۱) "ترقی پسندی کا جو اجتماع بھیونڈی شریف میں ہوا تھا وہ ادبی وہابیت کی طرف پہلا قدم تھا۔ پوت پالنے ہی میں استنجا، مسواک اور شرعی پائجامے پر اصرار کر رہا تھا۔"(۳۲) "یہ تو تھے ترقی پسندوں کے آثارالصنادید ان کے باقیات الصالحات گاؤں کے وہ غبی لڑکے ہیں جو سکول میں فیل ہوتے ہیں تو مدرسہ میں بٹھا دیے جاتے ہیں کہ عالم نہ سہی مولوی تو بنیں۔"(۳۳)

وارث علوی نے اپنے تنقیدی اسلوب میں طنز و مزاح، فقرے بازی اور بذلہ سنجی سے ناقدین کو ہنسنے اور مسکرانے کے آداب سکھائے ہیں۔ انتظار حسین وارث علوی کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ارے مجھے تو زبان و بیان ہی نے لوٹ لیا۔ تنقیدی فکر پر واہ واہ کرنے کا نمبر تو بعد میں آیا۔ تنقیدیوں بھی لکھی جاتی ہے کیا خوب بات کرنے کا ڈھنگ نکالا ہے کہ بقول کسے یہ تو فلسفہ کو پانی کرنے کا فن ہے۔ فلسفہ نہ سہی تنقیدی تصورات سہی مگر انہیں کس طرح پانی کیا ہے کہ ہم اسے شربت کی طرح غٹ غٹ پیتے چلتے گئے۔"(۳۴)

وارث علوی کی تمام کتابوں میں تخلیقیت، فقرہ بازی اور طنز و ظرافت کی اس قدر کثرت ہے کہ قاری تنقید کی بجائے ان کی شگفتہ اور بے ساختہ اسلوب کے بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، سیاست اور آرٹ و ادب ہر موضوع پر گہرے اور سنجیدہ مباحث ہیں۔ انہوں نے انگریزی، روسی، گجراتی اور مشرقی علوم سے استفادہ کیا ہے۔ اپنے تنقیدی مضامین میں انہوں نے ان سارے علوم کو موقع و محل کے مطابق استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کے یہاں طوالت اور تکرار بھی پیدا ہوئی ہے تاہم انہوں نے قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھا ہے۔ ناقدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بڑے نقاد وہ ہاتھی ہیں جن کی لڑائی میں اکثر اس درخت کا خوردہ ہو جاتا ہے جو سرسبز و شاداب ادب سے عبارت ہے۔"(۳۵) "میں جب ڈھائی تولے کے شاعر کو سورما اور تنقید کے بونے کو باؤن گزا کہنے سے انکار کرتا ہوں تو لوگ میری زبان کو غیر مہذب کہتے ہیں۔"(۳۶)

وارث علوی کے تنقیدی خیالات و نظریات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن ان کے اسلوب سے اختلاف کرنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی قاری تنقید و تخلیق سے قربت کا متمنی ہے تو وہ وارث علوی کی تنقیدی دنیا میں کودپڑے اس کے لیے جواہر پارے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ اشتیاق احمد، مضامین و مکالمات ڈاکٹر سہیل احمد خان، دروشن پرنٹرز، لاہور ۲۰۱۰ء، ص:۱۸۰

۲۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۵۱

۳۔ وارث علوی، ناخن کا قرض، مکتبۂ جدید، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص:۳۲

۴۔ وارث علوی، کچھ بچالا یا ہوں، گجرات اُردو اکادمی، گاندھی نگر، ۱۹۹۰ء، ص:۱۲

۵۔ وارث علوی نظر نظر میں، شاہ فیصل، ڈاکٹر، کتابی دنیا دہلی، ص:۱۴۰

۶۔ وارث علوی، غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۹۷

۷۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۱۶۔۱۱۷

۸۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو!، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۵

۹۔ وارث علوی، بورژواژی بر ژواژی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص:۵۹

۱۰۔ وارث علوی، غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۱۲

۱۱۔ جاوید صدیقی، وہ ڈیڑھ دن، مشمولہ، نیاورق شمارہ ۴۱-۴۲، شاداب رشید، ۲۰۱۴ء، ص:۲۶

۱۲۔ فضیل جعفری، وارث علوی اور فکشن کی تنقید، مشمولہ، وارث علوی نظر نظر میں، شاہ فیصل، ڈاکٹر، کتابی دنیا دہلی، ص:۲۵۷

۱۳۔ وارث علوی، غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۷۸

۱۴۔ وارث علوی، خندہ ہائے بیجا، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۱۷۱

۱۵۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اُردو جلد دوم، دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص:۱۰۴۰

۱۶۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو!، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۵

۱۷۔ وارث علوی، منتخب مضامین، فضلی سنز اُردو بازار، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۵۲

۱۸۔ وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص:۱۱۵

۱۹۔ شمس الحق عثمانی، فکشن کا تفہیم کار۔ وارث علوی، مشمولہ، سہ ماہی "نیاورق"، شمارہ ۴۲۔۴۱، مدیر شاداب رشید، مارچ ۲۰۱۴، ص:۱۹

۲۰۔ وارث علوی، بتخانہ چین، گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، ۲۰۱۰ء، ص:۳۲

۲۱۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو!، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۳۲

۲۲۔ وارث علوی، منتخب مضامین، فضلی سنز اُردو بازار، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۵۴

۲۳۔ وارث علوی، بتخانہ چین، گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، ۲۰۱۰ء، ص:۳۰

۲۴۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو!، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۸

۲۵۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۴۹

۲۶۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۳۶

۲۷۔ وارث علوی، خندہ ہائے بیجا، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۱۵۴

۲۸۔ وارث علوی، خندہ ہائے بیجا، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۲۰۴

۲۹۔ وارث علوی، بتخانہ چین، گجرات اُردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، ۲۰۱۰ء، ص:۱۸۹

۳۰۔ وارث علوی، ادب کا غیر اہم آدمی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۵

۳۱۔ وارث علوی خندہ ہائے بیجا، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۲۱

۳۲۔ وارث علوی خندہ ہائے بیجا، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۳۸

۳۳۔ وارث علوی تیسرے درجے کا مسافر، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۹۱

۳۴۔ وارث علوی غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۱۴

۳۵۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۵۳

۳۶۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو!، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۳